اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہماری کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ تب ہم ایک آفاقی تصورِ حیات کے حامل تھے۔ اہل ایمان کے دیگر طائفوں اور انبیائے سابقین کی باقیات کو ہم اپنا فطری حلیف خیال کرتے ایسا اس لئے کہ قرآن مجید نے ان سے موالات اور سماجی رابطوں کی نظری اساس فراہم کردی تھی۔ قرآن مجید کی وہ آیات جن میں طعام اہل کتاب کو حلال کیا گیا ہے اور جن میں کتابیہ عورتوں سے مومن مردوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے، وحی کے دفتین میں آج بھی موجود ہیں لیکن فقہائے سابقین کے بعض فیصلوں نے ان احکام کو عملی طور پر معطل کر رکھا ہے۔

٦

مسلم ذہن کی تشکیلِ نو

جب سے میں نے ایلزابیتھ ورٹزل کی Prozac Nation اور پیٹر کریمر کی Listening to Prozac پڑھی ہے' ایک عجیب طرح کے مسرت آمیز استعجاب سے دوچار ہوں۔ پروزک، ریٹالین اور زولوفٹ جیسی کرشماتی دوائیں جن کے استعمال سے آج لاکھوں لوگ کامیاب زندگی جی رہے ہیں اور جن کے بارے میں خیال عام ہے کہ ان کے استعمال سے شکستہ دل انسانوں کو نئی زندگی جینے کا حوصلہ ملتا ہے' واقعی اگر اتنی ہی کارگر ہیں تو کیا ان دواؤں کو شکست خوردہ مسلمانوں کی تبدیلیٔ قلب ونظر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ پروزک یا اس قبیل کی دوائیں بنیادی طور پر دماغ میں سیروٹونین (Serotonin) کی سطح میں اضافے کا کام انجام دیتی ہیں جس کی کمی سے انسان مایوسی، افسردگی، تشنج حتیٰ کہ اقدامِ خودکشی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ فی زمانہ کوئی ۲۸ ملین امریکی اس قبیل کی دواؤں کے سہارے معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ گویا دس فیصد امریکی باشندے ان کرشماتی دواؤں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ پھر اگر امریکی دنیا بھر میں غلبہ وتفوق اور کبر ونخوت جیسی نفسیات کے لئے جانے جاتے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔

جدید دماغی علوم (Neuro Science) کا ارتقاء چونکہ بڑی حد تک مغرب میں انجام پایا ہے اس لئے فطری طور پر یہاں ان ذہنی امراض کے تدارک کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے جن سے مغربی معاشرہ دوچار ہے، مثلاً ڈپریشن، تشنج اور خودکشی وغیرہ۔ البتہ اگر دماغی علوم کا ارتقاء عالم اسلام میں ہوا ہوتا تو شاید اس کی سب سے پہلی ترجیح یہ ہوتی کہ وہ مسلم ذہن کے اس کہنہ مرض کا علاج دریافت کرے جس میں یہ صدیوں سے مبتلا ہے اور جسے کانٹ (Kant) کی اصطلاح مستعار میں self-imposed immaturity کہا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں میں خود اعتمادی کا فقدان' یا مغرب سے ان کے مرعوب یا

مبہوت ہو جانے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ آج وہ ساری دنیا کو اپنے خلاف برسرِ پیکار پاتے ہیں بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دانشورانہ اور روحانی ورثے کا، جس کے یہ امین ہیں، خود اپنے اوپر دروازہ بند پاتے ہیں۔ صدیوں سے انہیں اپنے دماغ کی قدر و قیمت اور کارکردگی کے سلسلے میں گمراہ کیا جاتا رہا ہے اس لئے آج دماغ کے استعمال کی ہر دعوت انہیں خلاف مذہب معلوم ہوتی ہے۔ جمہور مسلمانوں میں یہ خیال کم و بیش عقیدے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ متقدمین نے غور و فکر کا سارا کام انجام دے ڈالا ہے بقول اشرف علی تھانوی ''متقدمین کے اصول و قواعد اس حد تک کافی و شافی ہیں کہ قیامت تک کوئی ایسا مسئلہ پیش نہیں آ سکتا جس کا جواز یا عدم جواز حتیٰ کہ جزئیات میں بھی ان اصولوں سے نہ نکل سکتا ہو'' (اشرف الجواب، اشرف علی تھانوی، ج ۲، ص ۳۱۲)۔ انسانی جسم میں رئس الاعضاء دماغ کی معطّلی کے اس عمل نے صدیوں سے امتِ مسلمہ کو عہد جاہلیت کی ذہنی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے جسے قرآن نے ﴿وجدنا آباء نا كذالك يفعلون﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

دماغ کی معطّلی کے اس فعل شنیع کو ہمارے متقدمین نے تقلیدِ سلف جیسی دلکش اصطلاحوں کا نام دے رکھا ہے۔ گزشتہ کئی صدیوں سے ہمارے وہ تمام مفکرین جوامت کی احیاء کے سلسلے میں سر توڑ جدوجہد کرتے رہے ہیں انہیں بالآخر سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ صورتِ حال کی اس سنگینی سے بعض مصلحین اس قدر نالاں ہوئے کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ احیائے امت کی بیل منڈھے نہیں چڑھتی تو انہوں نے اپنا راستہ بدل دیا یا مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ جب صدیوں سے مذہبی زندگی کی بزم دماغ کی معطّلی پر سجائی گئی ہو اور جب یہ باور کرایا جاتا رہا ہو کہ قرآن مجید سے راست اکتساب کا زمانہ لد گیا تو اس عقیدے کو بدل ڈالنا ایک ایسا لرزہ براندام خیال ہے جس کی اہل عموماً زوال پذیر امتیں نہیں ہوا کرتیں۔ ابوالکلام آزاد جنہوں نے ابتدائے عمر میں حزب اللہ کے قیام اور اس کے منشور کی اشاعت کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی ساکت مذہبی زندگی میں ہلچل کی کیفیت پیدا کر دی تھی، بہت جلد اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ مذہبی علماء کی مدد سے کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ محی الدین قصوری کے نام ایک خط میں انہوں نے اس خیال کا برملا اظہار کیا کہ جب تک ایک نیا مسلم ذہن تشکیل نہیں پا تا کسی تبدیلی کا خیال عبث ہے۔ آزاد کے خیال میں نئے مسلم ذہن کی تشکیل کے لئے ایک بالکل ہی نئے قسم کے اسلامی لٹریچر اور نئی تربیت کی ضرورت تھی۔ محمد اقبال، جنہیں عصر حاضر میں اسلامی فکر کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ بھی جب یہ کہتے ہیں کہ غیابِ خلافت میں عرب امپیریلزم سے آزاد ہو کر اسلام کے آفاقی قالب کی تشکیل میں مدد مل سکے گی تو ان کی مراد بھی یہی ہوتی ہے کہ قدماء کی تعبیرات سے ہٹ کر راست وحی کی روشنی میں غور و فکر کا ایک نیا ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔ اپنے خطبہ میں وہ اس بات کی پرزور وکالت کرتے ہیں کہ عہد جدید کے انسانوں کو زندگی کی بدلی ہوئی صورتِ حال اور اپنے تجربے کی روشنی میں اسلام کے اساسی فقہی اصولوں کی از سرِ نو تشریح و تعبیر کا حق دیا جانا چاہئے۔ جمال الدین افغانی اور ان کے متاثرین و تلامذہ بھی جب اجتہاد کی بات کرتے ہیں تو بنیادی طور پر وہ

دماغ کے وظیفۂ عمل کی بحالی پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ عبدہ رسالۃ التوحید میں تقلید کی مذمت میں یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں میں ماضی اور حال کی تمام نسلیں برابر کی حقدار ہیں' پھر یہ کیسا انصاف ہے کہ پچھلوں کو تو وحی ربانی سے اکتساب کا موقع ہو اور بعد کی نسلوں سے یہ حق چھین لیا جائے۔ اصولی طور پر روایتی مسلم فکر میں اس بات کی گنجائش تو موجود ہے کہ عامی اور عالم قرآن مجید سے اکتساب فیض کرے' اس میں غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھے۔ البتہ روایتی مسلم فکر میں اس بات کا پورا التزام کیا گیا ہے کہ وحی ربانی کی نئی تعبیر متقدمین سلف کی تعبیروں سے انحراف پر مبنی نہ ہو۔ یہ بات کوئی سمجھنے کو تیار نہیں کہ اگر ہماری ساری تعبیری کوششوں کا نتیجہ سلف کے فہم سے آگے نہیں بڑھتا یا الگ نتائج پیدا نہیں کرتا تو ایسے لایعنی غور و فکر کا حاصل ہی کیا ہے؟

گزشتہ چند صدیوں میں ہمارے یہاں زور و شور سے رجوع الی القرآن کی تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ مگر آج بھی رجوع الی القرآن یا تمسک بالکتاب محض ایک نعرہ ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم قرآن کی طرف واپسی کے ہر خیال کو متقدمین کی طرف واپسی پر محمول کرتے ہیں۔ ہم موجودہ نسل کے انسانوں کو یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ وحی ربانی سے اپنی توفیق بھر راست اکتساب کر سکیں۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں سقوطِ خلافت کے پیدا کردہ نفسیاتی بحران میں جن لوگوں نے احیائے اسلام کی تحریکیں چلائیں انہوں نے خاص طور پر وحی ربانی کو اپنی توجہ کا موضوع بنایا۔ مصر میں سید قطب کی ''فی ظلال القرآن'' اور برصغیر ہندو پاک میں ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن'' اور امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' اسلامیوں کی خاص توجہ کا مرکز رہی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ان تفسیروں کے اثرات پوری دنیا میں اسلام پسند حلقوں پر پڑے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تمسک بالکتاب کی یہ کوششیں اگر مطلوبہ نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ تمام تفسیریں جن کے معاصرانہ اسلوب پر نئی تعبیری کوششوں کا گمان ہوتا ہے دراصل اپنے فہم اور منہج تعبیر میں متقدمین سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھتیں۔ بھلا جب سب کچھ پرانا ہو تو نتائج نئے کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ نئی تفسیریں بھی قاری کو وحی ربانی پر راست غور و فکر کا راستہ دکھانے کے بجائے متقدمین کے طریقۂ تعبیر کا اسیر بنائے رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیس سال اور پچاس سال قرآن مجید سے اشتغال رکھنے کے باوجود ہمارے مفسرین جہاں سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں بالآخر اسی نکتہ پر اپنا سفر ختم کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ہما شما کو تو چھوڑیئے جب ربع صدی اور نصف صدی کی طویل مدت تک قرآن سے اشتغال رکھنے کے باوجود کوئی شخص خود کو حنفی اور شافعی کے حوالے سے پیش کرے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کی تقلید پر خود کو مجبور پائے تو بھلا ایسے اشتغال کو دانشورانہ تضیع اوقات کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر ائمہ اربعہ یا ماضی کے دیگر فقہائے عظام منزل من اللہ نہیں تھے اور ان کے فقہی دواوین محض عامی یا کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ترتیب دئے گئے ہیں تو بھلا ان اہل علم کو' جو قرآن مجید سے راست اکتساب کے دعوے دار ہوں اور جنہوں نے پچاس پچاس سال اس عمل میں لگایا ہو' کب زیب دیتا ہے کہ کتاب ہدایت سے راست واقفیت کے باوجود وہ اپنے

ہی جیسے انسانوں کے فہم پر تکیہ کرنے پر خود کو مجبور پائیں۔ جب تک ہم اس اعتماد کے حامل نہیں ہوتے کہ خدا کی وحی میں متقدمین کی طرح ہمارا بھی اپنا حصہ ہے اور جب تک ہم اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے کہ اگر متقدمین ہمارے فہم سے الگ تعبیر کا ایک منہج رکھنے کا حق رکھتے ہیں تو ہمیں بھی ان کی طرح اس بات کا حق حاصل ہے کہ ہم نئی دنیا میں نئے حالات کے تحت ان سے الگ طریقۂ تعبیر اختیار کرسکیں، تمسک بالکتاب کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ آج اکیسویں صدی میں پیش آنے والے مسائل کا جتنا کچھ اندازہ ہمیں ہے یقیناً ہمارے متقدمین اس بارے میں اتنی آگہی نہیں رکھتے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اکیسویں صدی میں قرآنی معاشرے کی تشکیل کے لئے ساتویں اور آٹھویں صدی کے اہل علم کو زحمت دی جائے جو نماز میں قصر کا حکم منزلوں کے تعین پر لگایا کرتے تھے جنہیں نہ تو کبھی خلائی راکٹ میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اور نہ اس بات کی خبر تھی کہ مشرق و مغرب کے دو غیر محرم انٹرنیٹ کی دنیا میں کبھی تخلیہ اختیار کرسکیں گے اور نہ ہی اس بات کی آگہی کہ ٹیلی مواصلات کے انقلاب اور ہوائی سفر کی عام سہولتوں کے باعث اکیسویں صدی میں دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحیں بے معنی ہوجائیں گی۔

تمسک بالکتاب کی یہ دعوت جو دراصل سلف صالحین کی اتباع کی دعوت تھی امت میں زندگی کی نئی روح پھونکنے میں ناکام رہی۔ سلف صالحین اپنی تمام تر جلالت علمی کے باوجود ہماری طرح انسان تھے اور انسان ہونے کی حیثیت سے ان سے لغزشوں کے صدور کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ علمائے سلف کے اجتہادات کو اگر زمانی و مکانی پس منظر میں دیکھا جاتا اور اگر انہیں وحی ربانی کی آخری تعبیر یا حرفِ آخر کی حیثیت حاصل نہ ہوتی تو آنے والے دنوں میں علمائے متقدمین کی التباساتی لغزشوں کی اصلاح کا امکان باقی رہتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ سیاسی زوال کے سبب فتنوں کے خوف سے عام انسانوں سے غور و فکر کا حق سلب کرلیا گیا۔ ہوسکتا ہے وقتی طور پر اس اسٹراٹیجی سے امت میں انتشار فکری کو کنٹرول کرنے میں مدد ملی ہو۔ البتہ آگے چل کر رفع فتنہ کی خاطر اٹھائے جانے والا یہ قدم فی نفسہ ایک بڑا فتنہ بن گیا۔ آنے والی صدیوں میں صورتِ حال اتنی خراب ہوگئی کہ ہر متنازع مسئلہ پر اجماع کا دعویٰ کیا جانے لگا اور یہ کہا جانے لگا کہ مسئلہ مذکور پر اجماع ہوچکا ہے لہٰذا اسے بحث کے لئے دوبارہ نہیں کھولا جاسکتا۔ حالانکہ کسی اجتہادی مسئلہ پر اجماع کے قیام کا خیال ایک انتہائی مہمل مغالطہ ہے جس پر کتاب و سنت، عقل اور تاریخ سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ بالفرض محال اگر کسی مسئلہ پر ماضی میں اہل علم کا اجماع ہوچکا ہو تو کیا اس موقف کا دوبارہ قرآن مجید کی روشنی میں تحلیل و تجزیہ نہیں کیا جاسکتا؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو موجودہ نسل کے مسلمانوں کے لئے قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ کی معنویت کیا رہ جاتی ہے؟ کیا ہمارے لئے قرآن صرف ایک خاموش کتاب ہے؟ کیا خدا اکیسویں صدی کے مسلمانوں سے راست خطاب نہیں کرتا؟ کیا قرآن مجید کی یہ دعوت ہمارے لئے اب اپنی معنویت کھوچکی ہے کہ ہم جو ہدایت کے متلاشی ہیں وحی ربانی میں مسلسل غور و فکر کرتے رہیں ﴿افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها﴾، اور کیا قرآن مجید جو پچھلوں کے لئے کتاب ہدایت تھی کیا ہمارے لئے صرف کتاب برکت ہے؟

﴿وجدنا آباء نا كذالك يفعلون﴾ کا سحر انگیز قومی نعرہ جو کبھی لات وعزیٰ کی پرستش کو ایک دلفریب نظریے کے طور پر پیش کرتا تھا آج سلف صالحین کے حوالے سے اس بات کا داعی ہے کہ اکیسویں صدی کا انسان قرآن مجید سے راست اکتساب کا کوئی خطرہ مول نہ لے۔ آباء پرستی کی اس لے نے، جو گزرتے وقتوں کے ساتھ مسلم دنیا میں مسلسل بڑھتی رہی ہے، سچ پوچھئے تو قرآن مجید کو اسلاف کی التباسات فکری کا اسیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ نئے دور کے لات وعزیٰ خشب وحجر سے تراشیدہ بے جان بت نہیں بلکہ وہ ائمہ متقدمین ہیں جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں تشریح وتعبیر کا وقیع کارنامہ انجام دیا ہے۔ وحی ربانی کی طرف ہمارے اس غیر عقلی رویے نے ہمارے لئے خدا کی زندہ اور لازوال وحی کو نہ صرف یہ کہ ایک منجمد کتابِ سکوت میں تبدیل کر دیا ہے بلکہ صدیوں سے کتابِ ہدایت سے محروم رہنے کی وجہ سے ہم من حیث الامۃ ایک بے سمت آوارہ روی کے شکار ہیں۔ ہمارے وہ مسائل جن سے ہم من حیث الامۃ ایک عرصے سے نبرد آزما ہیں ایک نئے طرزِ فکر کی شدید ضرورت کا احساس دلاتے ہیں لیکن ہم کسی قیمت پر بھی بند دماغی کو خیر باد کہنے کے لئے تیار نہیں۔ ذیل میں ہم چند مسائل کے اجمالی بیان سے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ ایک نئے زاویۂ فکر اور ایک نئے مسلم ذہن کی تشکیل کے بغیر کوئی واقعی پیش رفت کیونکر ناممکن ہے۔

قضیۂ فلسطین

فلسطین کا مسئلہ گزشتہ پچاس برسوں سے حل طلب ہے۔ اگر ایک طرف متشدد مذہبی یہودی اس خیال کے حامل ہیں کہ ارضِ کنعان میں چار مربع فٹ چلنا انہیں جنت کا حقدار بنانے کے لئے کافی ہے تو دوسری طرف مسلمان جو صدیوں سے اس سرزمین کے باسی رہے ہیں اور جن کے قانونی استحقاق کو کسی طرح چیلنج نہیں کیا جا سکتا اگر اس بارے میں گفت وشنید سے انکاری ہیں تو ان کا موقف یہ ہے کہ ارضِ فلسطین فقہی اعتبار سے اراضیٔ وقف ہے اور وقف کی نوعیت چونکہ دائمی ہوتی ہے اس لئے اس بارے میں کسی مصالحت یا گفت وشنید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دونوں طرف بے لوچ موقف پر جم جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں سے بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کا اتلاف عام ہے جس میں یقیناً کمزور نہتّے مسلمانوں کو نسبتاً بہت زیادہ قربانی پیش کرنا پڑ رہی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایسی اندھی گلی میں پھنس گئے ہوں جہاں آگے راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ جو لوگ ارضِ فلسطین سے سیکڑوں اور ہزاروں میل دور بیٹھے ہوں وہ یقیناً فلسطینی جانبازوں کو زبانی خراج تحسین پیش کر سکتے ہیں البتہ ان ماؤں بہنوں اور بیٹیوں سے پوچھئے جن کا ہر دن کوئی نہ کوئی قریبی عزیز یا تو ریاستی دہشت گردی کا نشانہ بن جاتا ہے یا اس کے سدباب کے لئے خودکش دھماکوں پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ مسئلہ فلسطین کا فی الوقت ممکنہ حل کیا ہو سکتا ہے اس بارے میں جب ہم نے مختلف علماء و مفکرین سے ان کی رائے جاننا چاہی تو اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اس مسئلہ کا دراصل کوئی حل ہے ہی نہیں۔ تو کیا انسانی جانوں کے

اتلاف کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا؟ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے نازک لمحوں میں بارہا ایسی جنگیں لڑی ہیں جہاں انہیں strategic retreat کا راستہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ اگر مسلمان اس وقت ریاست اسرائیل سے براہ راست ٹکر لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو سرِ دست اس مسئلہ کو التوا میں ڈالنا یا کسی مصالحتی فارمولے کو قبول کرنا ایک خالص قومی لڑائی میں بھی قرینِ عقل رویہ قرار پائے گا' نہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے منتشر اور نہتے گروہ غیر منظّم جنگ میں اپنی جانیں گنواتے رہیں۔ لیکن کیا وقف اراضی کے سلسلے میں ایک مختلف نقطۂ نظر اختیار کرنا ممکن ہے؟ کیا امت کا اجتماعی مفاد اس بات میں پوشیدہ ہے کہ حکمت وحی کی روشنی میں مسئلہ کا ازسرِ نو محاکمہ کیا جائے اور ہم کم از کم ذہنی طور پر اس بات کے لئے آمادہ ہوں کہ اس مسئلہ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے غور و فکر اور محاکے کا موضوع بنایا جائے۔ کیا عجب کہ خدا ہمارے اجتماعی غور و فکر کے نتیجے میں ہم پر کوئی نئی راہ منکشف کر دے۔ شرط یہ ہے کہ ہم دماغ کو حرکت دینے پر آمادہ ہوں۔

شیعہ سنی نزاع

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ آخری رسولؐ کی امت فکری طور پر دو مختلف خیموں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ تقسیم کے اس عمل کو ایسی فکری بنیادیں فراہم ہو گئی ہیں کہ اب ہمارے اہل فکر شیعہ سنی فرقے کے ارتکاز کو ایک نا قابل عمل خیال گردانتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری سے شیعہ اور سنی دھڑوں کا ارتقاء جن فکری بنیادیوں پر ہوا ہے ایسا سمجھا جاتا رہا ہے گویا اسلام کے یہ دو مختلف قالب من جانب اللہ ہوں۔ اگر ایک طرف سنی فکر میں ائمہ اربعہ کے بغیر مذہبی زندگی کا تصور ناممکن ہے تو دوسری طرف شیعہ فکر میں ائمہ معصومین و مامورین کے بغیر اسلام کی کوئی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیعہ اور سنی دونوں فکر کو اصل اسلامی قالب سے انحراف پر صدیاں گزری ہیں۔ اس تاریخی سفر میں دونوں کی تصویریں ایک دوسرے سے مختلف مشخص ہوتی رہی ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وحی ربانی میں راست غور و فکر کی ریت اگر دوبارہ قائم ہو سکے تو اس طویل فکری انحراف کی بساط لپیٹنا ممکن نہ ہو۔ دونوں طرف اگر اہل فکر مسلمانوں میں وحی کی لازوال روشنی سے استفادے کا رجحان عام ہو سکے اور اگر ہمارے اربابِ حل و عقد تاریخ کو وحی کا تابع کر سکیں تو اصولی طور پر صدیوں کے انحرافِ فکری کے خاتمے کی سبیل پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس کے لئے بھی آباء پرستی کو ترک کرنا اور دماغ کو حرکت دینا پہلی شرط ہے۔

ائمہ اربعہ

مجموعی طور پر سنی فکر ائمہ اربعہ کی نسبت سے چار مختلف خیموں میں منقسم ہے۔ ماضی میں جب عباسی اور فاطمی سلطنتیں اسلام

کے دورِ عظمت کا علامیہ سمجھی جاتی تھیں تو مختلف فقہی گروہوں کا آپس میں ٹکرانا، ایک دوسرے سے متحارب رہنا معمول کی بات تھی۔ اس باہمی خانہ جنگی اور مذہبی معرکے میں جانوں کا اتلاف بھی ہوتا تھا۔ عصر حاضر میں بھی جہاں مسلمانوں کو کوئی آزاد خطۂ زمین حکمرانی کے لئے میسر ہوا وہاں یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ یہاں کس فقہی مسلک کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوگی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس سوال کی سنگینی نے مغربی سیکولرزم کے لئے راہ ہموار کی۔ طالبان کے افغانستان میں اہل ایمان کے دوسرے فرقے ذمّی کی نفسیاتی فضا میں جینے پر مجبور رہے۔ مستقبل میں بھی جب کبھی مسلمانوں کو ایک آزاد خطۂ زمین حکمرانی کے لئے میسر ہوگا اسلامی اجتماعیت کی تشکیل میں یہ سوال پھر عود کر آئے گا کہ کس فقہی نظام کے تحت معاشرے کو منظّم کیا جائے۔ یہ کہنا کہ اکثریت کے مسلک کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونی چاہئے اقلیتی فقہ کے حاملین کے لئے اس لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ محض تعداد میں کمی انہیں اپنے اپنے خیموں کو خیرباد کہنے پر آمادہ نہیں کرسکتی کہ یہ ان کے لئے عقیدے اور ایمان کا مسئلہ ہوگا۔ عہدِ عباسی کی مسلکی خانہ جنگیاں اور موجودہ پاکستان میں مسلکی تشدد اسی خیال کی توثیق کرتے ہیں۔ تو کیا عصر حاضر میں مسلم معاشرے کی تشکیل نو کے لئے ائمہ اربعہ سے ماوراء اسلام کا ایک آفاقی اور اجتماعی قالب تشکیل دینا لازم ہوگا؟ ائمہ اربعہ اگر منزل من اللہ نہیں ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم فی زمانہ ان کے بغیر اسلام کو متصور کرسکیں؟ یقیناً یہ ایک انقلاب انگیز خیال ہے جس سے ایک بڑے تاریخی سفر کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔ اگر ائمہ اربعہ کے ظہور سے پہلے اسلام کی مکمل اور تابدار تصویر پائی جاتی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس آفاقی تصویر کو وحی ربانی کے بنیادی وثیقے کی روشنی میں آج دوبارہ منقح نہ کرسکیں۔ اگر حرم مکی میں چار فقہاء کے الگ الگ مصلّے، جن پر کوئی پانچ صدیوں تک عمل جاری رہا، چند بدوی مصلحین کی کوششوں سے لپیٹے جاسکتے ہیں تو اکیسویں صدی کے مصلحین کی اجتماعی کوششیں ہمیں صدیوں پر محیط اس فقہی بحران سے نجات کیوں نہیں دلاسکتیں؟

تعالوا الی کلمۃ سواء کی دعوت

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہماری کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ تب ہم ایک آفاقی تصورِ حیات کے حامل تھے۔ اہل ایمان کے دیگر طائفوں اور انبیائے سابقین کی باقیات کو ہم اپنا فطری حلیف خیال کرتے ایسا اس لئے کہ قرآن مجید نے ان سے موالات اور سماجی رابطوں کی نظری اساس فراہم کردی تھی۔ قرآن مجید کی وہ آیات جن میں طعام اہل کتاب کو حلال کیا گیا ہے اور جن میں کتابیہ عورتوں سے مومن مردوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے، وحی کے دفتین میں آج بھی موجود ہیں لیکن فقہائے سابقین کے بعض فیصلوں نے ان احکام کو عملی طور پر معطل کر رکھا ہے۔ اب ہم اہل کتاب اور ان جیسے دوسرے ایمانی طائفوں کو اپنا فطری حلیف سمجھنے کے بجائے انہیں کافر قرار دینے پر مصر ہیں۔ ہم اس خیال کے بھی قائل نہیں کہ دارالاسلام میں اسلام کے علاوہ دیگر

سماوی مذاہب اوران کے باقیات کوتمام تر مذہبی آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع دیا جانا چاہئے۔ حالانکہ ابتدائی صدیوں میں جب ہماری دعوت لوگوں کے دل ودماغ پر بجلیاں گرا رہی تھی اوراسلامی ریاست اپنی عظمت کے نصف النہار پر تھی عالم اسلام کے تقریباً تمام ہی بڑے شہروں میں مسلمان نہ صرف یہ کہ اقلیت میں تھے بلکہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں تمام تر سماجی اور مذہبی آزادی کے ساتھ خدائے لم یزل کی حمدوثنا سے معمور تھیں۔ تب ہم آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے خود کوتمام اہل ایمان طائفوں کا قائد سمجھتے اورکلمۃ سواء کی بنیاد پران کی حمایت کے حصول کوامر ربی خیال کرتے۔ اہل کتاب کی طرف ہمارے رویے میں تبدیلی، جس کی ابتداء عباسی بغداد میں ہوئی اور جس نے بعد کی صدیوں میں ایک جامد فقہی عقیدے کی حیثیت حاصل کرلی، قرآن کی آفاقیت سے مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہے۔

ایک نئی ابتداء کے لئے لازم ہے کہ ہم دیگر ایمانی طائفوں کے سلسلے میں قرآن کی روشنی میں اپنے فقہی رویے کا فی الفور محاسبہ کریں۔ شبہ اہل کتاب کے سلسلے میں بھی بعض سیاسی اور مذہبی عوامل کے تحت گفتگو کا دروازہ صدیوں سے بند ہے۔ خود برصغیر ہندوپاک میں اہل ہنود کے سلسلے میں البیرونی اور شہرستانی کے تحقیقی نتائج سے ہم نے یکسر آنکھیں بند کررکھی ہیں۔ اگر اہل ہنود کے بعض طائفے شبہ اہل کتاب کے معیار پر پورے اترتے ہیں، اگر ان کے یہاں بھی خدا، رسالت، آخرت، کتاب اور عمل صالح کا تصور پایا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں کلمۃ سواء کی بنیاد پر اسلام کے آفاقی مشن میں کھلے عام شرکت کی دعوت نہ دی جائے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انہیں متحارب گروپ کے طور پر دیکھیں اوران سے سماجی رشتوں کی بحالی، ان کے طعام کواپنے لئے حلال اوران کی عورتوں سے نکاح کو جائز نہ سمجھیں۔ فقہائے متقدمین نے بعض وقتی سیاسی عوامل کے زیراثر کتابیہ عورتوں سے نکاح اوراہل کتاب سے موالات پر جو پابندی عائد کردی تھی جب تک اسے ازسرنو تحلیل وتجزیہ کے لئے مباحثے کی میز پر نہیں لایا جاتا ایک نئے رویے کی تشکیل ممکن نہیں۔

عہد عباسی میں منقح ہونے والے فقہی ذہن نے جس سے بعد کی صدیوں میں تقلید محض کا کام لیا جاتا رہا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام جیسے ابدی اور آفاقی دین پر عہد وسطیٰ کا سماں طاری کررکھا ہے۔ وہ دین جسے تاریخ کے آخری لمحے تک اقوامِ عالم کی سیادت کا کام انجام دینا تھا وہ اپنے متبعین کے غیر عقلی اور تقلیدی رویے کی وجہ سے جدید دنیا سے کنارہ کشی پر مجبور ہے۔ جہاں بھی اسلامی معاشرے کی ازسرنو تشکیل کا غلغلہ بلند ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا عہد وسطیٰ کے سماجی منظرنامے کو پھر سے زندہ کیا جارہا ہو۔ غور وفکر پر مکمل پابندی لگانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کلیدی مذہبی اور سماجی ادارے آج وہ نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہیں جن کے تذکرے ہم قرونِ اولیٰ کی تاریخ میں پڑھتے ہیں۔ مثال کے طور پر قیامِ جمعہ جیسے بنیادی ادارے کو لیجئے جو بیک وقت عبادت بھی ہے اور جسے رشد وہدایت کے حوالے سے اجتماعی زندگی کی تنظیم وترتیب میں بھی اہم رول انجام دینا ہے۔ غیر عرب ممالک

میں جہاں حنفی فقہ خطبہ کی زبان کے سلسلے میں متشدد موقف رکھتی ہے اور جہاں سامع کو عہد سلاطین میں لکھے گئے خطبوں کی سماعت پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، خطبۂ جمعہ کا بنیادی وظیفہ معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ خطیب کے سامنے جب مؤذن خطبہ کے لئے اذان دے رہا ہوتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ خطبہ کے اعلان کے بجائے ایک طرح کی رسمی خانہ پری کے عمل میں مصروف ہے۔ دورانِ اذان اس کے دائیں اور بائیں طرف گھومنے میں اب اس لئے کوئی معنویت سمجھ میں نہیں آتی کہ کل جب مدینہ کی مسجد میں مؤذن دائیں اور بائیں جانب گھومتا تو اس کا مقصد آواز کو مختلف جہتوں میں منتشر کرنا تھا اب یہی کام لاؤڈ اسپیکر سے لیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مدینے کی وسعت بڑھ گئی اور لوگوں کا فی الفور اذانِ خطبہ سن کر جمع ہو جانا ممکن نہ رہا تو حضرت عمرؓ نے مسجد سے قدرے مسافت پر مقیم مسلمانوں کی سہولت کے لئے خطبہ سے کچھ پہلے ایک اور اذان کا اضافہ کر دیا۔ قیامِ جمعہ کے بنیادی فوائد کے حصول کے لئے اگر حضرت عمرؓ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ایک اور اذان کا اضافہ کر سکیں تو کیا لاؤڈ اسپیکر کے مروّج ہو جانے کے بعد بھی دائیں اور بائیں سمت میں گھومنے کی ضرورت باقی رہے گی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر غیر عرب معاشروں میں جہاں عربی کے تحریری خطبوں کو نہ پڑھنے والا سمجھتا ہو اور نہ سننے والا، کیا عقل اور وحی کی روشنی میں عربیت پر اصرار کا کوئی جواز ہے؟ اس قبیل کی ایک اور مثال قمری مہینوں کے تعین میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں ہلالِ عید یا ہلالِ رمضان کی چشمی شہادت کو عقیدے کا مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں روز و شب کی گردش کو منٹوں بلکہ سیکنڈوں میں ناپ لیا گیا ہو اور جہاں سورج اور چاند کے طلوع و غروب اور ظہور و غیوب کے بارے میں حتمی گوشوارے مرتب کر لئے گئے ہوں وہاں اگر اب بھی بعض قومیں عینی شہادت کے علاوہ دوسرے ذرائع کو یکسر مسترد کر دیں تو ان کے بارے میں یہی تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ صدیوں کے تحقیق و اکتشاف سے منھ موڑ کر اب بھی عہد وسطیٰ میں جینے پر مصر ہیں۔ سلفی دنیا جسے غیر مقلدین کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے وہاں بھی صورتِ حال کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ عید الفطر کے موقع پر ریاض، جدّہ اور دمام جیسے مدنی مراکز میں گیہوں کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کے ڈھیر، جسے صدقۂ فطر کے طور پر اہل ایمان غرباء میں تقسیم کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس بات کی چغلی کھا رہے ہوتے ہیں کہ مذہبی ذہن اب بھی عہدِ وسطیٰ کے سماجی مظہر کو عبودیت کی تکمیل کے لئے لازم خیال کرتا ہے۔ سلفی علماء کے نزدیک صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قدیم پیمانے کے مطابق گیہوں کی ایک مخصوص مقدار مستحقین کو دینا لازم ہے۔ ایک صارف معاشرے میں جہاں مفلوک الحال انسانوں کو بھی پکی پکائی روٹیاں مل جاتی ہوں گیہوں کے یہ چھوٹے چھوٹے پیکیٹ لینے والے اور دینے والے دونوں کے لئے نہ صرف یہ کہ باعث زحمت ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن بنے رہنے کے لئے لازم ہے کہ ہمارا کوئی نفسیاتی یا روحانی رابطہ کسی نہ کسی حوالے سے عہد وسطیٰ سے برقرار رہے۔

اسلام کو عہد وسطیٰ کے تہذیبی و نفسیاتی قالب میں مجسم دیکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ امت محمدیہ کے درونِ خانہ بحث و مباحثے

(Muslim Discourse) بڑی حد تک جدید دنیا سے غیر متعلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ مسائل جن پر ہمارے یہاں صدیوں سے بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے نہ تو بین الملی آفاقیت کے حامل ہیں اور نہ ہی ان سے جدید دنیا کا مستقبل وابستہ ہے۔ امت محمدیہ کے علمی حلقے، فقہاء کی مجلسیں اور دینی رسالوں کے صفحات ابھی ان بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں معتبر ہیں یا نہیں؟ مسلم عورت کو کشف وجہ کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ فوٹو گرافی حلال ہے یا حرام؟ اور یہ کہ ٹیلی ویژن کے پردوں پر ابھرنے والی تصویر عکس ہے یا صورت گری؟ ان داخلی مباحث پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی ایسی امت کے موضوعات نہیں ہو سکتے جسے اقوامِ عالم کی سیادت پر فائز کیا گیا ہو۔ بھلا جو لوگ اقوام عالم کو درپیش مسائل سے منھ موڑ کر صدیوں سے ان مسائل میں الجھے ہوں جن سے دوسری اقوام کو نہ کوئی دلچسپی ہو اور نہ ہی جن سے دنیا کا مستقبل وابستہ ہو ان کا مقام تاریخ کا ٹریش کین (trash-can) تو ہوسکتا ہے سیادت کا مرکزی اسٹیج نہیں۔ پرانا طرزِ فکر اور پرانا دماغ کسی نئی ابتداء کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم دماغ کو متحرک کرنے پر آمادہ نہ ہوں ہمارے لئے اپنے مختلف الابعاد زوال کا صحیح ادراک کرنا بھی مشکل ہوگا۔ تدبر، تفکر اور تعقل کی قرآنی دعوت ایک ایسے ذہن کی تشکیل میں ہماری مدد کرسکتی ہے جو خود اعتمادی کے ساتھ اپنے بنیادی وظیفے میں لگ سکے۔ اگر ایسا ہوسکا تو ہم بآسانی اس نکتہ کو سمجھ سکیں گے کہ اکیسویں صدی میں پیش آنے والے مسائل کو ماضی کے فقہاء نے ہمیشہ کے لئے فیصل نہیں کر دیا ہے اور یہ کہ وحی ربانی کی لازوال تجلی جس طرح پچھلی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہی ہے آج بھی ہماری رہنمائی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے سکتی ہے۔